سید طاہر حسین*

سعادت حسن منٹو—انسان، معاشرہ اور افسانہ: ناقدین کی آرا کی روشنی میں معنوی جہات کا مطالعہ

SAADAT HASAN MANTO: UNVEILING MAN, SOCIETY, AND STORY THROUGH THE EYES OF HIS CRITICS

Abstract: *This paper offers a brief critical overview of Saadat Hasan Manto through the views of major Urdu critics like Waris Alvi, M. Hasan Askari, Rashid Akhtar Nadvi, and Shahid Ahmad Dehlvi. They present Manto as a bold literary voice who exposed societal hypocrisies and gave voice to the marginalized. His uncompromising realism and emotional depth challenged moral conventions and revealed hidden truths. The study emphasizes that Manto's work is rich in symbolism and demands serious critical engagement due to its humanistic and psychological insight.*

Keywords: *Saadat Hasan Manto, Urdu Short Story, Realism, Social Contradictions, Critical Perspectives, Human Psychology, Exposure of Hypocrisy, Social Exploitation.*

تلخیص: یہ مضمون سعادت حسن منٹو پر چند اہم اردو نقادوں جیسے وارث علوی، محمد حسن عسکری، رشید اختر ندوی اور شاہد احمد دہلوی کے خیالات کی روشنی میں ایک مختصر تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ یہ نقاد منٹو کو ایک بے باک ادبی آواز کے طور پر پیش کرتے ہیں، جنہوں نے معاشرتی منافقت کو بے نقاب کیا اور محروم طبقوں کو ادب میں نمایاں جگہ دی۔ ان کا حقیقت پسندانہ اسلوب اور جذباتی گہرائی اخلاقی روایات کو چیلنج کرتی ہے اور پوشیدہ سچائیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ مطالعہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ منٹو کا کام علامتی معنویت اور انسانی بصیرت سے بھرپور ہے اور اس پر سنجیدہ تنقیدی توجہ درکار ہے۔

کلیدی الفاظ: سعادت حسن منٹو، اردو افسانہ، حقیقت نگاری، سماجی تضادات، تنقیدی زاویے، انسانی نفسیات، منافقت کا پردہ فاش، سماجی استحصال۔

اردو افسانے کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو وہ نام ہے جس کے فن کے سامنے تنقید بارہا ٹھہرتی ہے، جھکتی ہے، اور پھر نئے سرے سے اس کی گہرائیوں میں اُترنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ منٹو ایک ایسا فنکار ہے جس کے بارے میں وارث علوی کا اعتراف آج بھی ہمارے لئے چشم کشا ہے کہ ہم منٹو کو کبھی پوری طرح سمجھ ہی نہ سکے۔ عسکری کے نزدیک منٹو محض ایک فرد نہیں، ایک ادبی و تہذیبی مظہر ہے، جس کی زندگی اور موت کے معنی متعین کیے بغیر اردو ادب کی فکری تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ رشید اختر ندوی نے منٹو کے فن میں پائی جانے والی بے باکی، بے لاگ صداقت اور منافقت سے پاک جرأتِ اظہار کو اس کی اصل قوت قرار دیا، جب کہ شاہد احمد دہلوی کے نزدیک منٹو کی موت اردو افسانے کے لئے فالِ بد اور فکری افلاس کا آغاز ثابت ہوئی۔

* فلائٹ لیفٹننٹ، پی اے ایف کالج، مری۔

ایسے متضاد، مگر باوزن اور باوقار تنقیدی نقطہ ہائے نظر اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ منٹو کی شخصیت اور فن صرف ادبی بحثوں کا موضوع نہیں، بلکہ ایک ذہنی و تہذیبی معما بھی ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو دیکھنے کا اس کا جس قدر صاف، نڈر اور بے دھڑک انداز تھا، اسی قدر اس کے فن میں ایک عجیب طرح کی لطافت، کرب اور انسان دوستی کی لہر بھی موجود ہے۔ وہ حقیقت کے چبھتے ہوئے کانٹوں میں سے معنی کے پھول چننے والا وہ ضدی معمار تھا جس نے افسانے کی عمارت میں اپنی فکری بے سمتی، جذباتی طغیانی اور داخلی انتشار کو بھی فن کی مضبوط اینٹیں بنا دیا۔

منٹو کے فن کی عظمت کا راز اسی تجرباتی، بے ساختہ اور زندگی کی اصل روح سے جڑے ہوئے اسلوب میں پوشیدہ ہے۔ اس کا قلم کبھی جنسیت کے پردے میں لپٹی سماجی برہنگی کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے، تو کبھی انسانی حسرتوں، کچلی ہوئی خواہشوں اور معاشرتی جبر کے زخموں پر ایسا مرہم رکھتا ہے جس میں درد کا ایک بوند بھی شامل ہو۔ وہ ان کرداروں کو زبان دیتا ہے جن کے نام تک معاشرہ بولنے کا روادار نہیں ہوتا، اور اسی عمل میں وہ اردو افسانے کے لیے ایک نئے ضابطۂ جمالیات کی بنیاد رکھتا ہے۔

یہی وہ تناظر ہے جس میں نقادوں کی آرا منٹو کے فن، فکر اور شخصیت کی ایک بڑی، بامعنی اور تہذیبی تصویر بناتی ہے—ایسی تصویر جو اس کے مرنے کے بعد کہیں زیادہ روشن اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی۔ وارث علوی منٹو کے متعلق لکھتے ہیں:

> "منٹو کے متعلق میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ ہم اسے پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔ دراصل شاعری کے مقابلے میں افسانوں کو ہم آج بھی کم سمجھتے ہیں۔ ان سے سرسری گذرتے ہیں اور ان پر سہل انداز طریقہ سے خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ میں منٹو کو بہت بڑا افسانہ نگار سمجھتا ہوں اور اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے اس کا عاشق رہا ہوں۔ جب ہمارے ثقہ نقاد اس کے اکثر و بیشتر افسانوں کو فحش، جنس زادہ اور سنسنی خیز کہہ کر رد کرتے تو ایسے افسانوں کے متعلق جو بادی النظر میں مجھے جنس زادہ اور سنسنی خیز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ خود سے سوال کرتا کہ منٹو نے یہ افسانہ کیوں لکھا۔ اور افسانہ زیادہ دھیان سے پڑھتا، اس کے ہر جملے پر غور کرتا تو افسانہ کہ صحیح معنویت اور اس کے فن کار از منکشف ہوتا۔ آپ بھی اگر منٹو کے دلدادہ ہیں اور اس کے افسانوں کو محبت اور لگن سے پڑھتے رہے ہیں تو یہ دیکھ کر آپ کو خوشی ہوگی کہ اس کے بیشتر ایسے افسانے جنھیں ہماری تنقید نظر انداز کرتی رہی، میری گفتگو کا موضوع بنے ہیں۔ میں نے انھیں کوئی نئے معنی نہیں دیے ہیں۔ بس یہ ہوا ہے کہ مشاق نظرون کے سامنے افسانوں نے فن اور معنی کے رموز خود ہی بے نقاب کر دیے ہیں۔"(۱)

وارث علوی کی یہ رائے نہ صرف منٹو کے فہم کی دشواری کو واضح کرتی ہے بلکہ ہماری تنقیدی کم زوریوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ منٹو کی تحریریں بظاہر جتنی سیدھی، تیز اور جھنجھوڑ دینے والی ہیں، حقیقت میں اتنی ہی پرت دار، علامتی اور معنی خیز بھی ہیں۔ وارث علوی کا

اصرار کہ منٹو کے اکثر 'فحش' کہے جانے والے افسانے بھی نئی معنویت رکھتے ہیں، دراصل منٹو کے فن کے اس باطنی جہاں کی طرف اشارہ ہے جو محض سطح بینی سے نہیں کھلتا۔ یوں گفتگو کا پہلا دروازہ ہمیں اس ادراک تک لاتا ہے کہ منٹو کو سمجھنے کے لیے تیز نظر نہیں بلکہ عمیق اور بے تعصب نظر درکار ہے۔

عسکری کہتے ہیں کہ منٹو کی زندگی و موت کے بارے میں جذباتیت سے زیادہ معنی کی تلاش ضروری ہے۔ منٹو ایک فرد سے زیادہ ایک فکری مظہر کا نام ہے، اور بعض لوگوں کے نزدیک وہ اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔

> "جس دن منٹو مرا تھا، اس دن بھی میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو اس کی زندگی اور موت دونوں کے معنی متعین کرنے چاہیں۔ منٹو تو ان لوگوں میں سے تھا جو صرف ایک فرد یا ایک ادیب سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اب تو جذبات پر سستی کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیداہ ہوگئے، اور ہمارے لیے یہ سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے، بعض لوگوں کے خیال میں منٹو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔"۔(۲)

عسکری کی گفتگو منٹو کی فکری اور تہذیبی حیثیت کو ایک نئی سطح پر لے جاتی ہے۔ وہ اس کے فن کو محض ادبی دائرے میں قید نہیں کرتے بلکہ اسے اجتماعی شعور اور تہذیبی تجربے سے جوڑتے ہیں۔ یہاں گفتگو آگے بڑھ کر ہمیں اس اہم سوال کی طرف لے جاتی ہے کہ آخر منٹو کی موت نے اردو ادب پر اتنا گہرا اثر کیوں چھوڑا؟ عسکری کا کہنا ہے کہ منٹو کی زندگی اور موت دونوں کی معنویت ہے—یعنی منٹو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر ایک فکری احتجاج، ایک تہذیبی سوال بن چکا تھا۔ یوں گفتگو کی یہ کڑی ہمیں منٹو کی فکری گہرائی کی طرف متوجہ کرتی ہے، بجائے اس کے کہ ہم صرف اس کی شخصیت کے سطحی پہلوؤں سے لگے رہیں۔

رشید اختر ندوی کے مطابق منٹو کا فن اس کی بے لاگ حقیقت نگاری اور منافقت سے پاک مزاج کا آئینہ تھا۔ وہ فحش نگاری کے الزام کے باوجود منفرد افسانہ نگار رہے اور ان کا قلم بھی خود ان کی طرح ظالم، حساس اور منہ پھٹ تھا۔ وہ زندگی کی برہنگی کو ڈھانپنے کے قائل نہ تھے۔

> "منٹو کا فن اس کے بعد خوب نکھرا اور میری ذاتی احساس کہ وہ فحش نگاری کے الزام کے باوجود اردو کا منفرد افسانہ نگار رہے۔ اس کا قلم اسی کی طرح بڑا ظالم، بڑا احساس اور بڑا منہ پھٹ تھا۔ وہ رورعایت اور ریاکاری نہیں جانتا تھا۔ منٹو میں کئی انسانی عیب بھی تھے۔ لیکن اس میں منافقت قطعا نہیں تھی اور اسی وجہ سے اس کے فن میں بھی منافقت

کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جو چاہتا وہی لکھ دیتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا جب زندگی ننگی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں کہ اس لباس پہنائیں۔"(۳)

یہ اقتباس گفتگو کو ایک نئے رخ پر لے آتا ہے ــــ یعنی منٹو بطور انسان اور بطور فنکار دونوں ایک ہی مزاج کے حامل تھے۔ ان کے یہاں گفتار اور کردار کا تضاد نہیں ملتا۔ رشید اختر ندوی کا مخصوص جملہ" جب زندگی ننگی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں اسے لباس پہنانے والے؟" منٹو کے پورے نظریۂ فن کی مختصر مگر جامع تعریف ہے۔ اس مقام پر گفتگو اس حقیقت کی طرف بڑھتی ہے کہ منٹو کا فن اس کی شخصیت سے الگ نہیں، بلکہ اس کا توسیع یافتہ چہرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی ریاکاری کے خلاف منٹو کے تیور کبھی نرم نہیں پڑے۔ یوں گفتگو میں پہلی مرتبہ منٹو بطور 'انسانی سچائی کا بے رحم مؤرخ' سامنے آتے ہیں۔

دہلوی کے نزدیک منٹو کی موت اردو افسانے کے لیے فالِ بد تھی۔ اس کی نڈر، بے باک اور سچے فنکاری نے اردو افسانے کو نئی زندگی دی تھی، اور اس کی موت سے افسانہ نگاری کا قافلہ فکری طور پر مفلس ہو گیا۔ شاہد احمد دہلوی منٹو کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"منٹو کی موت اردو افسانے کے لیے ایک فالِ بد ہے۔ ایسا نڈر، ایسا بے باک، ایسا صاف گو افسانہ نگار اردو ادب نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ اس کی موت سے اردو کا افسانوی ادب مفلس ہو گیا۔ منٹو ہی ایک ایسا افسانہ نگار تھا جو تقسیم ہند کے بعد اعلیٰ درجے کے افسانے لکھ رہا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس نے ہمیں چونکا دینے والے افسانے دیے۔ نا مساعد حالات نے اس کے قلم کی جنبشیں تیز کر دیں۔ منٹو کو سوائے لکھنے کے اور کچھ نہ تھا۔ اس لیے رہ زندہ رہنے کے لیے لکھے جاتا تھا۔ منٹو مر گیا۔ پچھیس سال کی بحرانی زندگی کے بعد وہ موت کی نیند سو گیا۔ ہم نے ہمیشہ اپنے مردوں کی قدر کی ہے۔ منٹو کی قدر کرنے کا وقت بھی آپہنچا ہے۔ یہ ہمارے غیرت قومی کا سخت امتحان ہے۔ ہمیں منٹو کو ایک اچھا کفن دینا چاہیے"(۴)

گفتگو اب ایک جذباتی مگر حقیقت شناس موڑ پر آ پہنچتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی منٹو کی موت کو صرف ایک فرد کے مرنے کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے اردو افسانے کے خون میں دوڑتی ایک تخلیقی قوت کے رک جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ خیال کہ منٹو ہی تقسیم کے بعد اعلیٰ درجے کے افسانے لکھ رہا تھا ہمیں بتاتا ہے کہ منٹو نے کس بحرانی دور میں بھی فن کی آگ کو سرد نہ ہونے دیا۔ یہاں گفتگو آگے بڑھتے ہوئے اس احساس تک پہنچتی ہے کہ منٹو کا مر جانا محض 'ایک فنکار کا مر جانا' نہیں بلکہ ایک ذہنی بغاوت، ایک فکری توانا شعور کا ختم ہو جانا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں گفتگو پہلی بار منٹو کے فن کے تاریخی کردار کو اس کی ذاتی زندگی سے بالکل الگ دیکھتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کی ادبی حیثیت کا تعین ہم چاہے کسی بھی حوالے سے کرنا پسند کریں لیکن محمد حسن عسکری کے یہ الفاظ ضرور پیش نظر رکھنے چاہیے کہ:

"منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی اور اس میں سے جو پانی نکالا وہ گدلا یا کھاری سہی مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنوں کھودا ضرور، دوسرا یہ کہ اس میں پانی نکالا۔ ذرا گنیے تو سہی کہ اردو کہ کتنے ادیبوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی جا سکتی ہیں۔"(۵)

گفتگو یہاں اپنے فکری نقطۂ عروج کے قریب پہنچتی ہے۔ عسکری کا یہ قول دراصل منٹو کے فن کی *اخلاقی پیچیدگی اور جمالیاتی صداقت* کا عمیق اعتراف ہے۔ *ٹیڑھا کنواں* — یعنی منٹو کی زندگی میں بے سمتی، اضطراب، بے باکی، بدنامی، اور معاشرتی مخالفت *گدلا پانی* — یعنی وہ تلخ حقیقتیں جنہیں دیکھ کر انسان کی بصیرت اندھی ہو جائے لیکن عسکری کا اصل مدعا اس تصویر کے پس منظر میں ہے: منٹو نے کچھ 'کیا' تو سہی۔ اس نے تجربہ کیا، کھوج کی، اور سب سے بڑھ کر 'سچ' کہا — چاہے کڑوا تھا یا گدلا۔ گفتگو کے اس مرحلے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ منٹو کی اصل عظمت اس کی اخلاقی پیچیدگی میں نہیں، بلکہ اس کے *تخلیقی اقدام* میں ہے۔

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے بارے میں مختلف ناقدین کی آرا کا مطالعہ ہمیں ایک تدریجی فکری سفر سے گزارتا ہے۔ گفتگو کا آغاز وارث علوی کے اس اعتراف سے ہوتا ہے کہ منٹو کو سمجھنا آسان نہیں — اس کے فن میں وہ تہہ در تہہ پیچیدگیاں ہیں جن کے ادراک کے لیے محض ظاہری مطالعہ کافی نہیں۔ یہاں سے گفتگو محمد حسن عسکری کے اس نکتے کی طرف بڑھتی ہے کہ منٹو ایک فرد سے زیادہ ایک فکری مظہر کا نام ہے، ایک ایسا ادبی تجربہ جس کے معنی زندگی اور موت دونوں میں مضمر ہیں۔

رشید اختر ندوی اس سفر میں ایک نئی جہت شامل کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ منٹو کی اصل قوت اس کی بے باکی، صداقت اور منافقت سے پاک مزاج میں پوشیدہ ہے؛ وہ فن اور زندگی دونوں میں کسی پردے، کسی ریا، کسی نفسیاتی مصلحت کا قائل نہ تھا۔ اس کے بعد شاہد احمد دہلوی گفتگو کو ایک جذباتی مگر حقیقت پسند موڑ دیتے ہیں اور منٹو کی موت کو اردو افسانے کی فکری محرومی قرار دیتے ہیں — گویا منٹو کے ساتھ اردو افسانے کی وہ دھڑکن بھی رک گئی جو تقسیم کے بعد کے بحرانی دور میں بھی زندہ تھی۔

آخر میں ایک بار پھر عسکری کی بات سامنے آتی ہے، مگر اس بار زیادہ گہرائی کے ساتھ: منٹو نے جو کنواں کھودا، چاہے ٹیڑھا تھا، اور اس میں سے جو پانی نکالا چاہے گدلا تھا، مگر یہی تخلیق، یہی تجربہ، یہی جراتِ اظہار اس کی اصل عظمت ہے — اور اس معیار پر پورا اترنے والے اردو میں کتنے ادیب ہیں؟

یوں تمام آرا مل کر ایک ایسی جامع تصویر بناتی ہیں جس میں منٹو محض ایک افسانہ نگار نہیں رہتا بلکہ ایک فکری قوت، ایک اخلاقی معمہ اور ایک سماجی صداقت کا بے باک بیانیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کا فن زندگی کا آئینہ بھی ہے اور سماج کا پوسٹ مارٹم بھی۔ منٹو نے نہ

حقیقت سے نظریں چرائیں، نہ قلم کو مصلحت کا پابند بنایا؛ اسی لیے آج بھی اس کا فن ہمیں جھنجھوڑتا ہے، سوال اٹھاتا ہے اور ہمارے اپنے باطن سے ہمیں روبرو کر دیتا ہے۔

منٹو کا یہی بے لاگ، بے خوف اور سچا اظہارِ حقیقت اس کے فن کا مستقل حوالہ ہے—اور شاید یہی اس کا سب سے بڑا کارنامہ بھی۔

سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے بارے میں مختلف ناقدین کی آرا ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہیں کہ منٹو اردو افسانے کا وہ معما ہے جسے سمجھنے کے لیے محض فہم نہیں، بلکہ حوصلہ، صداقت اور بے لاگ نگاہ کی ضرورت ہے۔ وارث علوی نے جس مشکل فہم کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ دراصل اسی حقیقت کا پہلا در ہے۔ عسکری نے اسے ایک فکری مظہر قرار دے کر اس کی تخلیق اور حیات دونوں کے معنی متعین کرنے کا مطالبہ کیا، اور رشید اختر ندوی نے اس کے فن کی بنیاد میں موجود بے باکی اور عدم منافقت کی طرف توجہ دلائی۔ شاہد احمد دہلوی نے اس کی موت کو اردو افسانے کا اندوہناک نقصان بتایا، جب کہ عسکری کا وہ تاریخی جملہ—کہ منٹو نے کنواں کھودا اور اس میں سے پانی بھی نکالا—اس کی تخلیقی عظمت پر مہر ثبت کرتا ہے۔

ان تنقیدی آرا کے پس منظر میں جب ہم منٹو کے فن کو خود اس کی تحریروں کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو ایک اور جہت ہمارے سامنے کھلتی ہے—وہ سعادت حسن منٹو جو معاشرے کے ان افراد کی زندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے جن کے نام تک ہم اپنی روزمرہ زندگی میں لینا پسند نہیں کرتے۔ وہ منٹو جس کے بعض افسانے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے محسوس ہوتے ہیں، اور بعض زمین کی پاتال تک اُتر جاتے ہیں، مگر اس پوری نشیب و فراز کی تہذیبی قوس میں احساس اور جذبہ کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ شاید اسی لیے موت کے ذکر میں بھی وہ زندگی کی حرارت محسوس کرا دیتا ہے۔

منٹو نے معاشرے کا پوسٹ مارٹم اس لیے کیا کہ برائی کے اس احساس کو جگایا جائے جسے ہم نے محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ حسرتوں کے خون اور ارمانوں کے مرنے کے خلاف تھا؛ وہ ان زخموں پر مرہم رکھنے والا فنکار تھا جہاں درد بھی تھا اور صداقت بھی۔ زندگی اس کے لیے محض خارجی تجربہ نہ تھی بلکہ روح کی اس گہرائی تک اترنے کا عمل تھی جہاں سکون اور بے فکری کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی شدید تجربۂ حیات نے اسے بے خوف کر دیا—یوں کہ معاشرتی ریاکاری، ریاستی استحصال، مذہبی تشدد اور انسانی پستی کی ہر وہ پرت جسے معاشرہ چھپاتا ہے، منٹو نے بے نقاب کر کے رکھ دی۔

ادب چونکہ زندگی کا آئینہ ہے، اس لیے منٹو نے بھی زندگی کے اس باطنی چہرے کو پوری سچائی کے ساتھ دکھایا—وہ چہرہ جسے دیکھ کر انسان کی انسانیت پر سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ مذہب اور ریاست جہاں معاشرتی تربیت کے بنیادی ستون ہیں وہیں ان میں شامل استحصالی قوتوں کی منٹو نے سخت مخالفت کی، اس لیے کہ اس کے نزدیک انسانیت کا سب سے بڑا حوالہ مذہب کی اصل روح تھی، نہ کہ اس کے نام پر قائم جبر۔

اس فکری وضاحت، اس بے باکی اور احساسات کو دبانے سے انکار نے منٹو کی شخصیت کو اردو افسانوی دنیا میں منفرد، نڈر اور آزاد پسند مقام دیا۔ انسان ذات سے اس کی وابستگی، تضادات کے ساتھ جینے کی ہمت، زمانے کی تبدیلی کو قبول کرنے کا ذہن، سیاسی و معاشی ناہمواریوں کا شدید ادراک اور معاشرتی نفسیات کی گہری گرفت ـــ یہ سب وہ عناصر ہیں جو منٹو کو اپنی تحریک، اپنی سوچ، اپنی تخلیق اور اپنے اظہار میں یکتا بناتے ہیں۔

آخر کار تمام آرا اور تجربات مل کر اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ سعادت حسن منٹو نہ صرف اردو افسانے کا سب سے بے باک اور بے رحم نقادِ معاشرہ ہے بلکہ وہ فنکار بھی ہے جس نے زندگی کے ہر تاریک گوشے میں انسانی حرارت کو تلاش کیا۔ اس نے نفسیات، معاشرت، سیاست، جنسیات اور انسانیت کے ہر پہلو کو اتنی صداقت سے بیان کیا کہ اردو افسانہ اس کے بعد کبھی وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔

یوں منٹو ایک ایسا ادبی اور فکری استعارہ بن کر سامنے آتا ہے جس کی تفہیم آج بھی ہمارے لیے ایک مسلسل اور زندہ تجربہ ہے ـــ اور شاید یہی اس کی اصل عظمت ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ علوی، وارث۔ منٹو ایک مطالعہ، ۲۰۰۳، الحمرا پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۰

۲۔ عسکری، محمد حسن، نقوش منٹو نمبر، منٹو کا مقام، ادارہ فروغِ اردو، لاہور۔ ص ۲۷۲

۳۔ ندوی، رشید اختر، ناخن کا قرض،، مشمولہ: صہبا لکھنوی، منٹو ایک کتاب، ۱۹۹۴، مکتبہ افکار کراچی، ص ۵۸

۴۔ دہلوی، شاہد احمد، ہمیں منٹو کو ایک اچھا کفن دینا چاہیے، مشمولہ: احمد، سلیم، سعادت حسن مر گیا منٹو زندہ ہے،، ۲۰۰۵، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۲۰

۵۔ عسکری، محمد حسن، منٹو کا مقام، مشمولہ: نقوش منٹو نمبر شمارہ ۴۹۔ ۵۰،، ادارہ فروغِ اردو، لاہور۔ ص ۲۷۲

کتابیات:

۱۔ احمد، سلیم (مرتب)، سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۲۔ اندوی، رشید اختر، "ناخن کا قرض"، مشمولہ: صہبا لکھنوی، منٹو ایک کتاب، مکتبۂ افکار، کراچی، ۱۹۹۴ء۔

۳۔ طفیل، محمد، نقوش منٹو نمبر، شمارہ ۴۹۔ ۵۰ ادارۂ فروغِ اردو، لاہور۔

۵۔ علوی، وارث، منٹو: ایک مطالعہ، الحمرا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

☆☆☆☆☆